Dialogue Social Science Review (DSSR)
www.thedssr.com

ISSN Online: 3007-3154
ISSN Print: 3007-3146
Vol. 4 No. 6 (June) (2026)

Human Rights: Epistemological Basis and Application

Dr. Muhammad Afzal
Assistant Professor, Department of Islamic Studies, Al Ghazali University

Ehsan Waqaur Ahmad

Muhammad Harris Suhaib
Research Scholar, Department of Islamic Studies, Al-Ghazali University, Karachi.

Abstract
In contemporary discourse, human rights are often upheld as the central moral framework of modernity. This article critically examines that assumption, arguing that modern human rights derive from secular Enlightenment humanism rather than religious authority, thereby replacing traditional moral foundations. The study traces the development of these ideas from the Renaissance and Reformation through Enlightenment thinkers such as Rousseau and the French Revolution, through the Industrial Revolution, and culminating in the Universal Declaration of Human Rights (1948). It emphasizes key philosophical premises: anthropocentric humanism and rationalism, individual free will, and utilitarian (teleological) ethics, alongside a thorough secularization of morality and a critique of religion. Moral validity is measured by social utility and practical outcomes rather than any divine mandate. The Article also analyzes socio-political consequences: the elevation of individualism and materialism, the erosion of family and community structures, and the spread of Western cultural norms through globalization, neo-colonial influence, and "soft power." It questions the presumed universality of modern human rights, highlighting their cultural biases and ethical limitations. In conclusion, the study calls for a more nuanced understanding of human rights—one that recognizes their historical context and balances universal ideals with local values.
Keywords: Renaissance, Reformation, Modernity, Humanism, Free-will, Enlightment, Rationalism, Globalization

انسانی حقوق۔ علمیاتی اساس و اطلاق

تہذیب جدید میں انسانی حقوق کو تہذیب کے ایک بنیادی رکن کی حیثیت حاصل ہے۔ روشن خیالی کی بنیاد پر انسانی حقوق کے جدید تصورات دراصل اخلاقیات کا ایک نظام ہے۔ اس نظام میں اخلاقی اقدار کے ماٰخذ کی بجائے ان کے نتائج کو اہمیت دی جاتی ہے اور کسی سند کی بجائے انسانی تجربے کو ان حقوق کی اصل قرار دیا جاتا ہے۔ اخلاقی نظاموں کی قدیم اسناد میں شخصیات، کتابیں اور ادارے شامل ہوا کرتے تھے۔ انسانی حقوق کا موجودہ تصور ان میں سے کسی بنیاد کو اخلاقی اصولوں کی اصل نہیں سمجھتا۔ انسانی حقوق کی اخلاقی بنیاد سمجھنے کے لئے اخلاقیات کے دیگر نظاموں اور انسانی حقوق میں بنیادی فرق جاننا ضروری ہے۔ ان حقوق کی اصابت اور صداقت ان کے عملی نتائج سے متعین ہوتی ہے۔ انسانی

ISSN Online: 3007-3154
ISSN Print: 3007-3146
Vol. 4 No. 6 (June) (2026)

حقوق کی جانچ عظیم ہستیوں کے اقوال سے نہیں کی جاتی بلکہ انسانی معاشرے کے ہر لمحہ بدلتے اور کبھی ناختم ہونے والے امکانات اپنی افادیت کے پیش نظر ان تصورات کی نت نئی تشکیل کرتے رہتے ہیں۔ ان تصورات کے مطابق چونکہ انسانی معاشرہ تبدیل ہوتا رہتا ہے لہذا تاریخ کے کسی مخصوص دور اور سماج میں پائے جانے والے قوانین، رسوم و رواج، اقدار اور انسانی علوم کی کسی خاص سطح کو حتمی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ انقلاب فرانس ،صنعتی انقلاب اور مغرب میں آزادی کی دیگر تحریکوں میں مقبول اور ہر دل عزیز ہونے والے نعروں آزادی، ترقی،مساوات اور دیگر عنوانات (انسانی بقاء، علم تک رسائی، وسائل کی منصفانہ تقسیم وغیرہ) کی جگہ اب انسانی حقوق کی اصطلاح نے لے لی ہے۔سماجی و معاشرتی ارتقاء، افادیت پسندی اور آزادی، انسانی حقوق کے نئے تصورات کے بنیادی ستون ہیں۔ انسانی حقوق کے یہ تصورات اب ہیومن ازم کے نام سے باقاعدہ علمی ڈسپلن اور مکتب فکر کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔

ہیومن ازم تاریخی اور نظریاتی پہلو:

ہیومن ازم دراصل وہ فلسفیانہ اور ادبی تحریک ہے جو چودھویں صدی کے نصف ثانی تک اٹلی میں پیدا ہوئی، اوروہاں سے یورپ کے دوسرے ممالک میں پھیل گئی، جو بالآخر جدید ثقافت کی تشکیل کے اسباب میں سے ایک سبب بنی۔ ہیومن ازم ہر اس فلاسفی کو بھی کہتے ہیں جو انسانی قدر یا عزت کو تسلیم کرے اور اسے تمام چیزوں کا میزان قرار دے یا جو صرف انسانی طبیعت کو اپنی فکر کی حد یا دائرہ کار کی حیثیت سے لے۔ 1

ہیومن ازم کی اصطلاح سے عام طور پر یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ہیومن ازم کا مطلب "انسان سے محبت" ہے اور اس مکتب فکر میں انسانوں کی خدمت کے جذبے کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، اس کے برعکس ہیومن ازم کا مطلب انسان کو ہر شئے کی اصل قرار دینا یا انسان پرستی کے ہیں۔ یہ ایک ایسا نظام اور مکتب فکر ہے جس کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ انسان کو مذہب کے ذریعے حقیقت کی تلاش ، درپیش مسائل کے حل اور زندگی میں پیش آنے والے سوالات کا جواب تلاش نہیں کرنا چاہئے، بلکہ ان تمام امور میں صرف خود پر بھروسہ کرنے اور اپنی دنیا کو اپنی سوچ اور عمل کے ذریعے تعمیر کرنے پر ہے۔ ہیومن ازم کی رو سے

1 محمد احمد حافظ، سرمایہ دارانہ نظام، ایک تنقیدی جائزہ، الغزالی پبلی کیشنز، کراچی، ص۸۶

Dialogue Social Science Review (DSSR)
www.thedssr.com

ISSN Online: 3007-3154
ISSN Print: 3007-3146
Vol. 4 No. 6 (June) (2026)

صرف ایسی شناخت اور علم معتبر ہے جس کا منشاء انسان ہو نہ کہ خدا۔ ہیومن ازم کے مطابق محض ایسا عمل پسندیدہ اور جائز ہے جو انسانی خواہشات اور آرزوؤں کی جہت میں انجام پائے۔چنانچہ ہیومن ازم میں مذہب کا کوئی مقام یا کردار قابل قبول نہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ مکتب فکر سیکولر اور دنیا سے دین کی علیحدگی کی مبادیات میں شمار ہوتا ہے، کیونکہ اس کی وہ روح اور مرکزی خیال جو مختلف ہیومنسٹک فرقوں کی مشترکہ قدر کو تشکیل دیتی ہے، ہر معاملے میں انسان کو محور اور معیار قرار دینا ہے۔ یوں انسان کی زندگی یا کم از کم اس کی دنیوی زندگی میں مذہب کی کوئی جگہ نہیں۔ ہیومن ازم اس امر کی پہلی صورت تھی جو جدید دور میں دینی روح کی نفی کی شکل میں ظاہر ہوا تھا اور چونکہ یہ تصور ہر چیز کو انسانی معیار تک محدود کرنا چاہتا تھا، لہٰذا ایسا انسان خود ہی اپنا مقصد اور منتہا قرار پایا۔ انسانی تقدیس کے ان تصورات کے مطابق مفاہیم، حقائق اور اقدار، سب انسان کی پیدا کردہ ہیں (یا ہونی چاہئیں) اسی لیے اس عقیدے کو انسان پرستی یا انسان محوری کہا جاتا ہے۔
ہیومن ازم کی تحریک اپنی اصل کے اعتبار سے مذہب کی ضد تھی۔ اس تحریک کا مقصد عیسائی معاشرے میں تصور الٰہ، تصور رسول اور تصور آخرت کو ختم کردینا تھا۔ چناں چہ اس تحریک نے لوگوں کو ہر اس ہدایت کے انکار کی طرف ابھارا جو ربّانی یا آسمانی ہو اور ہر اس ضابطے سے بغاوت پر آمادہ کیا جس کی بنیاد ہدایتِ الٰہی تھی۔ انسائیکلو پیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس کے مطابق۔

فلسفے میں ہیومن ازم ہر طرح کی فطریت (ربانیت) اور کلیت کی ضد ہے۔ یہ ایک ایسا فلسفیانہ رجحان ہے جو انسانی تجربوں کی تشریحات کو ہر طرح کے فلسفے کا اولین مرکز توجہ قرار دیتا اور اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ اس کام کے لیے انسانی علم کافی ہے۔ [2]

انسانی حقوق، تہذیب کی علمیاتی اساس:

معاصر فکر اور تہذیب جدید کے اصول و اساسیات کے پس منظر میں اہم بات یہ ہے کہ مذہب کے اعتقادی نظام کے حوالے سے ابتداءً تشکیک و ارتیاب اور بالآخر اس کے انکار کے بعد مذہبی اخلاقیات کے جواز کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی۔ یہ انسانی تاریخ اور سماج کی ایک حقیقت ہے کہ مذہب انسان کو ایک اعلیٰ اور برتر مقصد زندگی کی

[2] ایضاً، ص۸۷

Dialogue Social Science Review (DSSR)
www.thedssr.com

ISSN Online: 3007-3154
ISSN Print: 3007-3146
Vol. 4 No. 6 (June) (2026)

طرف راغب کرتا ہے، وہ انسان کو جذبات پرستی اور عارضی منافع کے حصول کی بجائے زندگی کے ایک ذمہ دارانہ طرزِ عمل، خیر خواہی اور ایثار کو پیش نظر رکھتا اور یوں معاشرتی اور سماجی استحکام کا باعث بنتا ہے۔ مذہب کے انکار کے بعد انسانی زندگی کی اس انتہائی اہم ضرورت اور خلا کو پر کرنے کیلئے "انسانی حقوق" کو ایک مکمل اخلاقی نظام کی حیثیت دے دی گئی۔ انسانی حقوق کی اصابت اور صداقت کی تعیین کا معیار انسانی سماجی ارتقاء کے تحت انسانی معاشروں کے تجربات کو قرار دیا گیا۔ مذہبی اخلاقی تصورات جن کی بنیاد آفاقی اخلاقی اصولوں اور تاریخ انسانی کی عظیم ترین شخصیتوں یعنی بانیان مذاھب کے ذاتی کردار و عمل پر ہوتی تھی، کو خیرباد کہتے ہوئے انسانی حقوق کی اصابت کو ان معیارات کے عملی نتائج اور زندگی میں ان کے افادی تصورات سے جوڑدیا گیا۔ یہ اخلاقی معاملات میں انسان کے خود مکتفی ہونے کا اعلان بلکہ دیگر الفاظ میں خود انسان پرستی کا آغاز تھا۔

انسانی حقوق کے تصورات کا ارتقاء:

تاریخی اعتبار سے یورپ میں اٹھارہویں صدی کے وسط کو انسانی حقوق کے تصورات کی ابتدا اور ارتقاء کا دور خیال کیا جاتا ہے۔ نالائق اور خودغرض حکمرانوں اور غاصب مذہبی گروہوں سے تنگ فرانسیسی عوام حکمران طبقات کا مزید بوجھ اٹھانے سے قاصر ہو چکے تھے۔ انقلاب فرانس سے ڈیڑھ دہائی قبل روسو اس انقلاب کو فکری بنیادیں فراہم کر چکا تھا۔

انسانی حریت اور آزادی کے حوالے سے روسو کے نظریات کس قدر بلند آہنگ تھے اس کا اندازہ اس کی مشہور زمانہ تصنیف "معاہدہ عمرانی" کے پہلے جملے سے ہوجاتا ہے۔ روسو لکھتا ہے"انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جدھر دیکھو وہ پابہ زنجیر ہے۔[3]

روسو کے خیال میں زندگی، آزادی اور حصول راحت انسان کا ایسا حق ہے جسے کوئی چھین نہیں سکتا۔[4] وہ حالت فطرت کو ایک جبلی حالت قرار دیتے ہوئے تمدن پر فوقیت دیتا ہے۔ فطرت سے روسو کی مراد سادگی، مساوات، بھلائی اور آزادی ہے۔ اس کے خیال میں تہذیب وتمدن کے لوازم تعیش، بداخلاقی ، غلامی اور ایمان و یقین کی کمزوری ہیں۔ روسو کے افکار میں یہ بات نمایاں طور پر نظر آتی ہے کہ وہ جدید تہذیب وتمدن کے

---

[3] روسو، ژاں ژاک، معاہدہ عمرانی، ترجمہ، ڈاکٹر محمود حسین، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۱۹۹۸ء، ص ۵۴

[4] رابرٹ بی ڈاؤنز، فکر جدید کے سانچے، ترجمہ، غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۲۱۵

ISSN Online: 3007-3154
ISSN Print: 3007-3146
DIALOGUE SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol. 4 No. 6 (June) (2026)

مفاسد کے خلاف ردعمل کے نتیجے میں سلبی اور تفریط پر مبنی رویہ رکھتا ہے۔ انسانی معاشرت اور تمدن کو وہ جبری اور مسلط کردہ نظام سمجھتا ہے ۔ روسو کی تمام تر شخصی متانت اور جذبہ انسانی ہمدردی کے باوجود انقلاب فرانس سے ماقبل حالات کے پس منظر میں انسانی آزادی کے حوالے سے روسو کے نظریات کسی قدر مبالغہ آمیز ہیں۔روسو دراصل فطرت کو ایک مکمل مذہب اور نظام کی شکل میں دیکھتا ہے۔ جس کے مقابل تمدن ایک جبری نظام ہے۔تمدن کو ایک جبری نظام سمجھنے کے باوجود روسو کے خیال میں انسان زندگی کے اس درجہ پر پہنچ چکا ہے کہ اب غیر متمدن صورت حال قائم نہیں رہ سکتی اور بنی نوع انسان کے سرے سے فنا ہونے کا اندیشہ ہے اگر وہ اپنی زندگی کا انداز نہ بدلے۔[5]

روسو معاہدہ عمرانی میں اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ انسان کے طبعی اور ذاتی حقوق کا تحفظ ایک بنیادی انسانی ضرورت ہے۔ معاشرے کی تمام اکائیوں یعنی افراد کے نفوس اور املاک کی حفاظت کا فریضہ کس طرح سرانجام دیا جاسکتا ہے؟ روسو اس سوال کو حل کرنے کے لئے معاہدہ عمرانی کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔ وہ انسانوں پر حکومت کے اختیار کو اس اجازت سے مشروط کرتا ہے کہ یہ اختیار انسانوں کی اپنی مرضی کے تحت ہونا چاہیئے۔ وہ حکومت کے ایک مثالی نظام کو ارادہ اجتماعی (عوامی رائے عامہ) کی بنیاد پر استوار کرنا چاہتا ہے۔ روسو زبان خلق کو نقارہ خدا قرار دیتا ہے۔ اس کے اس تصور کے تحت ارادہ اجتماعی قانون اور انصاف کا سرچشمہ ہے۔ عوامی رائے کے نتیجے میں قائم ہونے والی مقتدر قوت کو روسو "خیر مشترک" قرار دیتا ہے۔[6]

روسو کے مطابق چونکہ خلقتاً ایک انسان کو دوسرے انسانوں پر حکومت کا حق نہیں اور چونکہ قوت حق کی بنیاد نہیں لہذا تمام جائز حکومت کی بنیاد معاہدے قرار پاتے ہیں۔[7]

---

5 معاہدہ عمرانی، ص ۷۰

6 تقی امینی، مولانا محمد، لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر، فضلی سنز لمیٹڈ، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۹۶

7 معاہدہ عمرانی ، ص ۶۲

ISSN Online: 3007-3154
ISSN Print: 3007-3146
Vol. 4 No. 6 (June) (2026)

قوت ایک جسمانی شے ہے اور میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس کے اثرات سے کون سا اخلاقی نتیجہ پیدا ہوسکتا ہے، زور سے زیر ہونا رضا مندی کا نہیں مجبوری کا فعل ہے ۔ زیادہ سے زیادہ اسے مصلحت پر مبنی قرار دیا جاسکتا ہے، پھر یہ فرض کیا![8]

جنگ میں کوئی ڈاکو مجھے آن گھیرے تو ظاہر ہے کہ مجبوری میں اپنی روپوں کی تھیلی مجھے اس کے حوالہ کرنی پڑے گی لیکن کیا اخلاقاً بھی یہ میرا فرض ہوتا کہ اگر میں تھیلی چھپا سکتا ہوں تب بھی اسے نکال کر اس کی نذر کردوں اس لئے کہ ڈاکو کا طمانچہ یقیناً ایک برتر قوت ہے؟ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ قوت کی بنا پر حق، قائم نہیں ہوتا اور جائز قوتوں کے سوا کسی کی اطاعت ہم پر فرض نہیں ہے۔[9]

روسو کے خیال میں بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اجتماع کی کوئی ایسی شکل پیدا کی جائے جس میں تمام قوت اجتماعی کے ذریعے ہر شریک کی جان و مال کی حفاظت ہوسکے اور جس کی بنا پر گوہر شخص کل یں‌شریک ہو تاہم وہ خود صرف اپنی تابعداری کرسکے اور اس کی وہی آزادی برقرار رہے جو اسے پہلے حاصل تھی" یہ ہے وہ بنیادی مسئلہ جس کا حل"معاہدہ عمرانی" پیش کرتا ہے۔[10]

روسو کی اس تصنیف کو جدید فلفسہ سیاسیات اوراخلاقیات میں اہم ترین مصدر کی حیثیت حاصل ہے۔ فرانسیسی انقلاب کے زمانہ میں روسو کی یہ تصنیف انقلابیوں کی "انجیل "تھی ۔ان کے لئے دنیا کے تمام سیاسی حقائق اس کے اندر موجود تھے، ایسے حقائق جو ہر زمانہ اور ہر ملک میں یکساں طور پر صحیح ہوں۔ ان کی نظر میں انسانیت کا بھلا اسی میں تھا کہ "معاہدہ عمرانی" کے اصولوں کو عملی جامہ پہنایا جائے۔[11]

اٹھارہویں صدی کا آخر سیاسی اعتبار سے جمہوریت اور جمہوری فکر کے عروج کا زمانہ ہے (انقلاب فرانس کے متصل بعد) یہی وہ دور ہے جس میں عام آدمی کے حقوق اور انفرادیت کا غلغلہ بلند ہوا۔ زندگی کے ہر مظہر کی عام آدمی کی ضرورت کے لحاظ سے تشریح شروع ہوئی اور انسان پرستی نے باقاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کی۔

---

8 ایضاً، ص ٦٠

9 ایضاً، ص ٦٠

10 ایضاً، ص ٧٠

11 معاہدہ عمرانی ، مقدمہ ڈاکٹر محمود حسین ، ص ٣٦

ISSN Online: 3007-3154
ISSN Print: 3007-3146
Vol. 4 No. 6 (June) (2026)

انسانی حقوق کے جدید تصورات میں مذہب اور معاشرتی اخلاقی ضابطوں کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کر کے اصل مقصد حیات یعنی سب سے بڑا خیر آزادی کو قرار دیا گیا ہے۔ مذہب تصوراله کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ تہذیب چونکہ مذہب اور تصور الہ کو ترک کر چکی تھی لہذا اسے اپنے تشخص کی شناخت کے لیے کوئی بنیاد اور اساس درکار تھی۔ مذہب کے انکار اور لامذہبیت کو اختیار کرنے کے بعد انسانی معاشرے کی تنظیم اور اس کے اخلاقی اور معاشرتی معاملات میں نظم و ضبط پیدا کرنے اور تہذیب کی معاشرتی بنیادیں استوار کرنے کے لئے انسانی حقوق کے تصور کو فروغ دیا گیا۔تہذیب نے انسانی حقوق کو اپنا تشخص اور علمیاتی اساس قرار دیا اور خدا کی جگہ انسان کو الہ کی حیثیت دیدی گئی۔ مغربی تہذیب وتمدن میں اللہ کے انکار کے بعد انسان کے الہ ہونے کی روش بہت نمایاں ہے، انسانی حقوق کے عنوان سے شخصی آزادی کے تمام تر نئے تصورات اسی روش کا مظہر ہیں۔

فلسفہ الحاد اور لامذہبیت نے جس برق رفتاری سے دنیا میں ترقی کی اس کی بڑی وجہ آزادخیالی ہے ۔ آغاز میں تو اس تحریک نے محض اس لیے سر اٹھایا تھا کہ اس کے ذریعے عوام کے ذہنوں کو مذہب اور کلیساء کے ناروا بندھنوں سے آزاد کرایا جائے۔ اس لحاظ سے یہ نہایت اچھی تحریک تھی اس نے یورپ کے عوام میں احساس اور شعور پیدا کیا، انہیں حالات پر غور و فکر کرنا سکھایا انہیں یہ بتایا کہ وہ کن کن مظالم کا شکار ہیں۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس آزاد خیالی نے ذہنی انارکی کی شکل اختیار کرلی اور اب "روشن خیالی" کے یہ معنی قرار پائے کہ انسان کو ہر قسم کی پابندی سے آزاد ہونا چاہیے۔ خواہ وہ پابندی مذہب کی عاید کردہ ہو یا سماج کی۔ اس آزاد خیالی کی عملی انتہا یہ تھی کہ ہر وہ چیز جو پہلے سے چلی آتی ہو ، وہ چاہے اپنے اندر صداقت و افادیت کے کتنے ہی پہلو رکھتی ہو ، اسے بہرحال رد کر دینا اور اس کے مقابلہ میں کوئی انوکھی اورنئی بات کہنا ہی روشن خیالی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔[12]

آزادی، ترقی اور مساوات انسانی حقوق کی بنیادیں:

آج کی دنیا میں ذرائع ابلاغ کے زور پر انسانی حقوق کا غلغلہ مچا ہوا ہے۔ عالمی سطح پر باقاعدہ ادارے اور تنظیمیں انسانی حقوق کے تحفظ اور فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔ انسانیت کی بقا اور استحکام

12 عبدالحمید صدیقی، پروفیسر، انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام ، اسلامک پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص۲۱

ISSN Online: 3007-3154
ISSN Print: 3007-3146
Vol. 4 No. 6 (June) (2026)

کے لیے مغربی مفکرین نے اپنے تئیں جو اصول اور ضابطے وضع کیے ، انھیں انسانی حقوق کا نام دیا گیاہے۔ ان حقوق کی جڑیں تین اصولوں میں پیوست ہیں یعنی آزادی، ترقی اور مساوات، لہٰذا انسانی حقوق کے یہ جدید تصورات مادی ترقی کو انسان کا مقصد اور خواب، جدید تعلیم کو اس ترقی کا ذریعہ اور آزادی کو انسان کی حقیقی بنیادی ضرورت گردانتے ہیں۔

آزادی، مساوات اور ترقی کے خوشنما نعرے کا نتیجہ یورپ میں تین بنیادی اقدار کی صورت میں ظاہر ہوا۔ انسان کی مطلق آزادی کا مطلب یہ تھا کہ وہ خالق کی بندگی سے نکل جائے۔ مساوات کا مطلب یہ تھا کہ کسی ہدایت کی ضرورت محسوس نہ کی جائے (یعنی کسی شخص واحد کو یہ مقام حاصل نہیں ہے کہ اس کے اقوال وافعال باقی انسانوں کیلئے حجت ہوں، تمام انسان برابر ہیں) اور محض مادی ترقی کا نتیجہ حقیقی معرفت سے بے اعتنائی تھی۔ لہٰذا اس تحریک کے نتیجے میں عبادت ، ہدایت اور معرفت سے یورپی معاشرہ ہاتھ دھو بیٹھا۔ انفرادی سطح پر لبرل ازم (آزاد خیالی) اور اجتماعی سطح پر سیکولرازم (لادینیت) آزادی اور ترقی کے مظاہر ہیں۔

ہر دم متغیر اس کائنات کی رنگا رنگی اور بوقلمونیوں کے نتیجے میں ارتقائی تصورات کے زیر اثر مسلسل ترقی اور اجتماعی معیار زندگی کو بڑھانے کی نا ختم ہونے والی خواہش انسان کا اہم ترین مقصد اور بنیادی حق قرار دی گئی۔ انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی مادی ترقی انسانی حقوق کی اس اخلاقیات کی بنیادی قدر ٹھہری۔ نتیجتاً انسانی ذہن اور شعور کی تمام صلاحیتیں اسی مادی ترقی کے تجزیے اور اس کی عملی صورت گری میں مصروف ہوئیں۔

فرانسیسی انقلاب اور بعدازاں امریکا کا اعلان آزادی ۱۷۷۶ء روسو کے بیان کردہ انہی اصولوں پر مبنی تھا ، جس کے تحت آزادی مساوات اور ترقی کو انسان کے بنیادی حقوق قرار دیا گیا تھا۔ سماجی ارتقائی تصورات اور انسان کی مطلق آزادی کی بنیاد پر قائم اس نظریہ اخلاقیات کا نکتہ عروج ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے منظور ہونے والا انسانی حقوق کا عالمی منشور ہے۔ انسانی حقوق کے اس عالمی منشور کو ایک عالمی اخلاقی عقیدے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

مذہب کے انکار اور جدید تہذیب کے ارتقائی اخلاقی تصورات کی ترویج اور صنعتی انقلاب کے بعد وسائل کی تقسیم کے حوالے سے پیدا ہونے والے تنازعات کے نتیجے میں سماج کے

Dialogue Social Science Review (DSSR)
www.thedssr.com

ISSN Online: 3007-3154
ISSN Print: 3007-3146
Vol. 4 No. 6 (June) (2026)

مختلف طبقات کے درمیان پیدا ہونے والی نزاعی کشمکش اور بین الاقوامی کھینچا تانی کو قابو میں رکھنا تیس شقوں پر مشتمل اس چارٹر کے بنیادی محرکات ہیں۔

انسانی حقوق کے اس چارٹر کو جبر اور استبداد کے خلاف بغاوت اور رد عمل سے بچنے اور قانون کی عملداری کے ذریعے انسانی حقوق کے تحفظ کا منشور قرار دیا گیا۔ دنیا کے تمام انسانوں کو حاصل وسیع تر آزادی کے تحت معاشرتی زندگی اور اس کے معیارات کو بلند تر کرنے کا عزم اس چارٹر کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔ انسانوں کی آزادی کے اس تصور کو انسانی ضمیر اور عقل کا تقاضا قرار دیا گیا ہے۔ انسانی حقوق کے اس چارٹر کا مطالعہ یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ چارٹر کا بنیادی زور اسی جانب ہے کہ فرد کی ذہنی اور فکری تربیت اسی اخلاقی سانچے میں ڈھالی جاسکے جو جدید تہذیب کے معیارات پر پوری اترتی ہو۔ چارٹر کے چیدہ چیدہ نکات حسب ذیل ہیں۔

انسانی حقوق کا یہ عالمی منشور تمام اقوام کے واسطے حصول مقصد کا مشترک معیار ہوگا تاکہ ہر فرد اور معاشرے کا ہر ادارہ اس منشور کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہوئے تعلیم و تبلیغ کے ذریعے ان حقوق اور آزادیوں کا احترام پیدا کرے اور انہیں قومی اور بین الاقوامی کارروائیوں کے ذریعے ممبر ملکوں میں اور ان قوموں میں جو ممبر ملکوں کے ماتحت ہوں، منوانے کے لئے بتدریج کوشش کر سکے۔ تمام انسان آزاد اور حقوق و عزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انہیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوئی ہے، اس لیے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ سلوک کرنا چاہئے۔[13]

یوں انسانی حقوق کے چارٹر کی پہلی ہی شق مذہب کو زندگی سے خارج کرتے ہوئے آزاد انسان کی عقل کو اخلاقی معیارات کا پیمانہ قرار دیتی ہے۔ انسانی حقوق کے مغربی تصورات کی عالمی سطح پر ترویج اور فروغ کا ذریعہ تعلیم کو بنایا گیا ہے۔

تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی پوری نشوونما ہوگا اور وہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ وہ تمام قوموں اور نسلی یا مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی

---

[13] انسانی حقوق کا عالمی منشور، شق نمبر ا، پیرا نمبر ا

Dialogue Social Science Review (DSSR)
www.thedssr.com

ISSN Online: 3007-3154
ISSN Print: 3007-3146
Vol. 4 No. 6 (June) (2026)

مفاہمت ، رواداری اور دوستی کو ترقی دے گی اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی۔[14]

انسانی حقوق کے منشور میں اظہار رائے کی لامحدود اور مطلق آزادی کو بنیادی انسانی حق قرار دیا گیا ہے۔

"ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنی رائے قائم کرے اور جس ذریعے سے چاہے بغیر ملکی سرحدوں کا خیال کیے علم اور خیالات کی تلاش کرے، انہیں حاصل کرے اور ان کی تبلیغ کرے"[15]

قومی، نسلی، وطنی، علاقائی اور مختلف رواجی اور تہذیبی تصورات کی بجائے یہ چارٹر مغربی اخلاقی تصورات کو بین الاقوامی نظام اخلاق کے طور پر اپنانے کی ترغیب دیتا ہے، چنانچہ انسانی حقوق کے منشور میں حقوق کے نام پر عالمگیریت اور جدید ریاستی نظام کی راہیں ہموار کی گئی ہیں۔

"ہر شخص ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی نظام میں شامل ہونے کا حقدار ہے جس میں وہ تمام آزادی اور حقوق حاصل ہو سکیں جو اس اعلان میں پیش کر دیے گئے ہیں۔"[16]

پرائیویٹ اور نجی معاملات میں ہر شخص کو کھلی چھوٹ دیتے ہوئے انفرادیت پسندی کو بطور ایک نظریہ تسلیم کیا گیا ہے

"اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہوگا جو دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کرانے اور ان کا احترام کرانے کی غرض سے یا جمہوری نظام میں اخلاق، امن عامہ اور عام فلاح و بہبود کے مناسب لوازمات کو پورا کرنے کے لئے قانون کی طرف سے عائد کیے گئے ہیں۔"[17]

---

[14] انسانی حقوق کا عالمی منشور، شق نمبر ۲۶، پیرا نمبر ۲

[15] انسانی حقوق کا عالمی منشور، شق نمبر ۱۹

[16] انسانی حقوق کا عالمی منشور، شق نمبر ۲۸

[17] انسانی حقوق کا عالمی منشور شق نمبر ۲۹ ، پیرا نمبر ۲

ISSN Online: 3007-3154
ISSN Print: 3007-3146
Vol. 4 No. 6 (June) (2026)

گویا قانون کا دائرہ ان معاملات کی حد تک ہوگا جہاں کسی دوسرے کا حق متاثر ہوتا ہو، بصورت دیگر قانون کو کسی کے ذاتی اور شخصی (پرائیویٹ) معاملہ میں مداخلت کا کوئی حق نہیں۔ شخصی آزادی کا یہ وہ تصور ہے جس کے نتیجے میں مغربی معاشرت ہر قسم کے حدودوقیود، خاندانی نظام اور اس کے ثمرات سے ہاتھ دھو بیٹھی ہے اور انفرادیت پسندی کے غیر معمولی (اور غیر فطری) رجحان کو تقویت ملی ہے۔

تہذیبی بالادستی اور انسانی حقوق:

انسانی حقوق کا یہ منشور مغربی تصور حیات اور تہذیب و تمدن کے قیام و استحکام اور اس کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کی ایک باضابطہ عالمی کوشش ہے۔ چنانچہ اقوام متحدہ کی رکنیت کے لیے جس میثاق پر دستخط لیے جاتے ہیں، اس کے مشمولات و مندرجات انسانیت پر تہذیب جدید کی بالادستی کے قیام کو ممکن بنارہے ہیں۔ یوں جو ملک اس عالمی ادارے کے ساتھ مربوط ہوجاتاہے، عملاً وہ اپنی آزادی کھوبیٹھتا ہے۔ اقوام متحدہ کے ذریعے تمام ممبر ممالک کو اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ انسانی حقوق کے اس منشور کو عالمی اور ناقابل چیلنج قانون تسلیم کرتے ہوئے اس پر دستخط کریں۔ چناچہ تمام ممالک یو این او کے رکن ہونے کی حیثیت سے پابند ہوتے ہیں کہ اپنے ممالک کے دستور وقانون کو انسانی حقوق کے چارٹر سے ہٹ کر عمل میں نہیں لائیں گے۔ انسانی حقوق کا نظریہ (Doctrine) تمام بین الاقوامی قوانین اور عالمی سطح سے لے کر علاقائی سطح تک کے تمام اداروں میں بھرپور طور پر کارفرما اور ان پر اثرانداز ہے۔ بنیادی انسانی حقوق ہر سطح پر تسلیم کیے جاتے اور عالمی سطح پر حکومتوں سے لے کر این جی اوز تک کے ذریعے کیے جانے والے اقدامات اور پبلک پالیسی کی بنیادیں تشکیل دیتے ہیں۔ انسانی حقوق کے نظریے کو یوں بھی واضح کیا جاسکتا ہے کہ اسے ایک مشترکہ عالمی ضابطہ اخلاق یا طریق اظہار (World Moral Language) کا نام دیا گیا ہے۔

اقوام عالم کی جمعیت یعنی اقوام متحدہ جدید مغرب کی تخلیق ہے، دنیا کے تمام ملک اس ادارے کے رکن ہیں۔ مغرب جمہوریت کا علمبردار اور جمہوریت ہی کو واحد اور اعلیٰ ترین سیاسی انتظام کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، جمہوریت کے اصول کی رو سے اس ادارے کو فیصلہ کن کردار ادا کرنا چاہیے، مگر جنرل اسمبلی میں صرف تقریریں ہوتی ہیں اور اس کی

ISSN Online: 3007-3154
ISSN Print: 3007-3146
Vol. 4 No. 6 (June) (2026)

قراردادوں کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔ جنرل اسمبلی کے بالمقابل اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل ہے۔ اس کونسل کے پانچ مستقل اراکین ہیں۔ ان پانچ اراکین کے پاس کسی بھی قرار داد کو مسترد کرنے کا حق (Veto Power)ہے، مغربی تہذیب وحی کو نہیں مانتی مگر اُس نے دنیا کے پانچ بڑے ملکوں کو دنیا کی تقدیر کا خدا بنایا ہوا ہے اور ان کی رائے کو وحی۔ بالفاظ دیگر ویٹوپاور جمہوریت کے نام پر مطلق العنان بادشاہت کا دوسرا نام ہے۔

جہاں تک انسانی حقوق کے چارٹر کی پہلی شق میں ذکر کردہ مساوات اور بھائی چارے (Equality and Fraternity)کا تعلق ہے تو تہذیب جدید میں نہ کہیں مساوات ہے اور نہ ہی بھائی چارہ۔مغرب ہی کے ایک ادارے آکسفیم انٹرنیشنل[18] (Oxfam International) کی رپورٹ کے مطابق دنیا کی ساری دولت کا ۸۲ فیصد دنیا کے صرف ایک فیصد لوگوں کے پاس ہے۔ دنیا کے ایک فیصد لوگوں کے پاس اتنی دولت ہے کہ دنیا کی موجودہ غربت اگر لوٹ کر بار بار آجائے تو اسے سات مرتبہ ختم کیا جاسکتا ہے۔ ۲۰۱۵ء میں دنیا کی صرف ۵۶ فیصد دولت ایک فیصد مال دار لوگوں کے ہاتھ میں تھی، مگر صرف تین برسوں میں ایک فیصد نے اتنی ترقی کی کہ وہ دنیا کی کُل دولت کے ۸۲ فیصد کے مالک ہوگئے۔[19]

گلوبلائزیشن (تفصیلی تذکرہ آگے آرہا ہے) اور ملٹی نیشنل کلچر کے فروغ کے تحت دنیا کے وسائل ایک مخصوص طبقہ کے ہاتھ میں اس تیزی اور سرعت سے منتقل ہوئے ہیں کہ تاریخ انسانی میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ معاشی اور اقتصادی پہلو کے ساتھ ساتھ اگر ذہنی اور فکری سطح پر دیکھا جائے تو مغرب نے نئے نوآبادیاتی بندوبست میں تیسری دنیا کے انسانوں سے ان کا تاریخی اور تہذیبی تشخص چھینتے ہوئے ایک نیا نوآبادیاتی تشخص مسلط کر دیا ہے۔ اس نئے عالمی نوآبادیاتی تشخص کا تقاضا اور اس کے معماروں کی مسلسل یہ کوشش ہے کہ تیسری دنیا کے عوام اپنے ماضی سے کسی طور پر کوئی زندہ رشتہ استوار نہ کر سکیں۔ انہیں اس بات کا یقین دلایا گیا ہے کہ تمہارا سیاسی ماضی آمرانہ اور ثقافتی ماضی زوال آمادہ تھا۔

[18] (آکسفیم انٹرنیشنل بیس غیر سرکاری تنظیموں کا ایک اتحاد ہے جو دنیا سے نا انصافی اور غربت ختم کرنے کے لیے کام کرتا ہے)

[19] روزنامہ ڈان کراچی۔ ۲۸ جنوری ۲۰۱۸ء

Dialogue Social Science Review (DSSR)
www.thedssr.com

ISSN Online: 3007-3154
ISSN Print: 3007-3146
Vol. 4 No. 6 (June) (2026)

اس کے برعکس تمہارا حال روشن خیالی، ترقی ، نئے سیاسی اور آیئنی نظام اور نئے تعلیمی بندوبست سے آراستہ ہے۔ یوں انہیں ان کے ماضی سے برگشتہ کرتے ہوئے یہ یقین دلایا گیا ہے کہ ان کا پسماندگی سے خروج، ترقی پذیری کی جانب انتقال اور بالآخر ترقی یافتہ ہونے میں واحد رکاوٹ ان کا ثقافتی ماضی ہے۔ دنیاوی اور مادی ترقی کا یہ خواب بذات خود بھی بہت دلکش ہے اور اسے بُننے والوں نے جس مہارت سے اسے بُنا ہے ، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نئے نوآبادیاتی تجربے کے اسیر سیاسی طور پر آزاد ہو جانے کے باوجود ذہنی غلامی اور سخت نفسیاتی مرعوبیت کا شکار ہیں۔

انسانی حقوق،ترقی اور مساوات کے دعوؤں کے پس منظر میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جدید ترین ذرائع اطلاعات و مواصلات، برقیات، کمپیوٹر اور ڈیجیٹلائزیشن تک جزوی رسائی مہیا کرنے کے باوجود سامراجی معاشی نوآبادیاتی بندوبست نے ترقی کی رکاوٹوں کو ختم نہیں کیا بلکہ نئے اور مؤثر انداز میں ایک نئ شکل دے دی ہے۔ سامراجی انتظام نے معاشی و سماجی طور پر ان معاشروں کو ترقی نہیں کرنے دی جہاں جہاں ان کا تسلط تھا، لہٰذا یہ اور زیادہ پسماندہ ہوگئے ہیں۔ اگر کہیں ترقی کے آثار نظر آتے ہیں تو وہ محتاجی اور انحصاری (Dependence) کی ایک قسم ہے، سرمایہ دارانہ نوآبادیاتی نظام نے کسی نئے سماجی اور اقتصادی ڈھانچے کو پروان نہیں چڑھنے دیا۔

ماضی میں طاقتور، کمزور پر حملہ آور ہو کر ان کے وسائل پر قبضہ کرتا تھا اور ان کی افرادی قوت کو اپنا تابع بناتا تھا لیکن اب دور جدید میں طریقہ کار بدل گیا ہے۔ اب عالمی استعماری قوتوں نے اپنے ایجنڈا کے نفاذ کیلئے جس طریقہ کار کو ذریعہ بنایا ہے، اس میں اقتصادیات اور اجتماعی و ثقافتی قوانین کے ساتھ انسانی حقوق بھی بطور خاص شامل ہیں۔ یہ تزویراتی منصوبہ بندی (Strategic Planning) کے وہ ستون ہیں جنھیں بنیاد بنا کر طاقتور ممالک کسی بھی کمزور ملک میں مداخلت اور اس پر سیاسی، تجارتی اور معاشی پابندیاں عائد کرنے کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک کو براہ راست یا عالمی مالیاتی اداروں کے ذریعے مالی امداد اور قرضے دے کر اپنے معاشی مفادات اور تہذیبی ایجنڈا کو آگے بڑھانے کی راہ ہموار کی جاتی ہے۔ اس ضمن میں لبرل ازم کے تحفظ کے حوالے سے قانون سازی اور بعض عالمی تجارتی اصول ایک اہم ہتھیار کے طور پر مغرب کے پاس

Dialogue Social Science Review (DSSR)
www.thedssr.com

ISSN Online: 3007-3154
ISSN Print: 3007-3146
Vol. 4 No. 6 (June) (2026)

موجود ہیں۔ مذکورہ طریقہ کار سے اہداف حاصل نہ ہونے کی صورت میں ہائی پرنسپلز (نام نہاد اعلیٰ انسانی اخلاقیات) کا سہارا لیا جاتا ہے جس میں انسانی حقوق کا مسئلہ سرفہرست ہے، اسے سافٹ پاور بھی کہا جاتا ہے۔ سافٹ پاور میں انسانی حقوق کے تحفظ کا دعویٰ ایک خوشنما اور موثر ترین دعویٰ کی حیثیت رکھتا ہے، جس کی آڑ لیتے ہوئے طاقتور ممالک انتہائی آسانی کے ساتھ کمزور ممالک پر دباؤ بڑھاتے ہیں اور انہیں غیر ملکی ایجنڈا قبول کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ طاقتور ممالک بسااوقات اپنے مفادات دیکھتے ہوئے پورے معاشرے کے برعکس صرف چند افراد کے حقوق کے نام پر بھی بڑے بڑے اقدامات کر بیٹھتے ہیں لیکن اگر دوسری جانب کوئی ملک یا گروہ ایسا ہو جو انسانی حقوق کے ان طاقتور علمبرداروں کا حامی ہو اس سے صرف نظر کیا جاتا ہے، خواہ وہ انسانی حقوق کی پامالی کا کسی بھی انتہائی حد تک مرتکب قرار پایا گیا ہو۔ انسانی حقوق کے حوالے سے یہ وہ صورتحال ہے کہ جو تیسری دنیا کے ممالک کی عکاسی کرتی ہے۔ آزادی اور ترقی کے پس منظر میں واقعہ یہ ہے کہ عصر جدید میں ترقی کا "معیاری" اظہار مغرب میں ہو رہا ہے اور مغرب کی یہ ساری ترقی جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی مرہون منت ہے جس کی پشت پر سرمایہ داری کی کمک ہے۔ بالفاظ دیگر سائنس سرمایہ داری کا آلہ اور سرمایہ آزادی کی کلید ہے، کیونکہ سرمایہ ہی وہ شئے ہے جو انسان کی ہر خواہش کے حصول کو ممکن بناتا ہے۔ آزادی بجنسہٖ کچھ نہیں ہوتی بلکہ آزادی اپنے اظہار میں سرمائے کی محتاج ہے، گویا سرمایہ آزادی کا مجسم پیکر ہے، لہٰذا آزادی کے آدرشوں سے کماحقہ فائدہ اٹھانے کیلئے زر اور سرمایہ کے حصول کی نا ختم ہونے والی مسلسل جدوجہد جدید انسان کی ترقی کی معراج ہے۔ زر پرستی کے اس تصور نے یہ اعتقاد اس قدر راسخ کردیا ہے کہ اب دولت ہی فرد اور سلطنت کی عظمت کا باعث شمار ہوتی ہے۔ پروفیسر جوڈ کے مطابق۔

جو نظریہ حیات اس زمانہ پر مستولی اور غالب ہے وہ اقتصادی نظریہ اور ہر مسئلہ اور معاملہ کو پیٹ اور جیب کے نقطہ نظر سے دیکھنا اور جانچنا ہے۔[20]

انسانی حقوق کے جدید تصورات کے نتائج واثرات:

Joad, C.E.M, Guide to Modern Wickedness, Faber and Faber, 1944, P.114 20

Dialogue Social Science Review (DSSR)
www.thedssr.com

ISSN Online: 3007-3154
ISSN Print: 3007-3146
Vol. 4 No. 6 (June) (2026)

مادی ترقی کا یہ نقطہ نظر اور طریقہ فکر استغراق کے اس مقام پر پہنچ چکا ہے کہ معاصر فکر کا دعویٰ ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے عمل کو زیادہ سے زیادہ مالی فائدہ پر منحصر رکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ معاشی تنظیم کا یہ اصول جدید تہذیب کے ادب، اخلاقیات، مذہب، عقل و منطق اور نظام حکومت کی تشکیل کا بنیادی جوہر ہے۔ خدا طلبی کی بجائے مادی منافع کے حصول اور زرطلبی کی یہ حرص اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ دولت اور جاہ کی کوئی بڑی سے بڑی مقدار بھی تشفی کے لئے کافی نہیں۔

مغربی تہذیب و اقتدار کے اس دور میں درحقیقت نہ علم کا حقیقی ذوق ہے نہ دین کا، نہ کوئی اور ذوق لطیف کام کر رہا ہے۔ بالشت بھر پیٹ نے زندگی کی ساری وسعت گھیر لی ہے۔ عالم خیال میں کتابیں تصنیف کرنے والے خوش فکر مصنفین جو چاہیں لکھیں، عملی زندگی میں اس وقت صرف ایک قوت محرکہ اور ایک زندہ حقیقت پائی جاتی ہے اور وہ پیٹ ہے یا جیب۔[21]

انسانی حقوق کے نام پر خود بینی اور خود غرضی کا ایک ایسا مخصوص مزاج پیدا ہوچکا ہے جس کا خاصہ یہ ہے کہ انسان حقوق طلب کرنے میں تو بڑا مستعد ہے لیکن فرائض ادا کرنے میں وہ سرگرمی دکھائی نہیں دیتی۔ انفرادی، اجتماعی اور طبقاتی سطح پر یہ خود غرضی لامذہبی نقطہ نظر کا لازمی نتیجہ تھی کیونکہ جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس زندگی کے بعد کوئی زندگی نہیں اور اس مادی زندگی کی لذتوں اور فائدوں کے سوا اور کسی حقیقت کا وجود نہیں تو پھر انسان خود غرض کیوں نہ ہو اور ہر قسم کی لذتوں سے خود کو کیوں ممتنع رکھے؟ یہی وجہ ہے کہ روسو کہتا ہے کہ آزادی خواہش نفس کی اتباع کا نام ہے۔

[22]".Freedom means doing only what one wants to do"

(آزادی کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص وہ کچھ کرسکے جو وہ چاہے)

روسو کا کہنا ہے کہ معاشرے کو حق ہے کہ اس آزادی کو جبراً نافذ کرے، اگر کوئی اس اصول آزادی کی اتباع نہ کرے تو بالجبر اس سے اطاعت کروائی جائے۔

[21] ابوالحسن علی، ندوی، مولانا، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ص ۲۹۰

Baradat Leon, Political Ideologies, Their Origins and Impect, New Jersy Prentice Hall, 2000, P.81 22

Dialogue Social Science Review (DSSR)
www.thedssr.com

ISSN Online: 3007-3154
ISSN Print: 3007-3146
Vol. 4 No. 6 (June) (2026)

If those in the minority refuse to follow the general will, they are violating their own will and ,thus are refusing to be free. Therefore, people who refuse to comply with the general will [23]and thus with their, own best interest, can be forced to comply

(اگر کچھ لوگ ارادہ عمومی (آزادی) کو اختیار کرنے سے انکار کریں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی ہی نفی کررہے ہیں اور آزاد ہونے کا انکار۔ لہٰذا جو لوگ ارادہ عمومی پر عمل سے انکار کریں تو انھیں ان کے ذاتی اور بہترین مفاد میں ارادہ عمومی پر عمل کیلئے مجبور کیا جائے گا)

روسو کے درج بالا بیان سے مغربی فکر میں پائے جانیوالے سخت تضاد کی نشاندہی ہوتی ہے۔ روسو اپنی ابتداء انسان کی آزادی سے کرتا ہے اور بالآخر اسے رائے عامہ یا دیگر الفاظ میں اجتماعی نظم (ریاست) کی سخت پابندیوں اور جبر میں دھکیل دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برٹرینڈرسل کے خیال میں روسو کے نظریات جمہوریت کیلئے صرف زبانی جمع خرچ کرتے ہیں اور ایک جابرانہ ریاست کے جواز کی طرف مائل ہیں۔ 24

مارٹن لوتھر کو عقل ونقل، ڈیکارٹ کو روح اور مادے،روسو، والٹیئر اور ہیگل کو انفرادیت اور اجتماعیت کے درمیان پیش آنے والی کشمکش کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ مغربی فکر نے ہمیشہ مظہر ہی کو حقیقت قرار دے ڈالا۔ یہ مغربی فکر کی مبالغہ آمیزی ہی کا شاخسانہ تھا کہ روح کے تقاضوں کی تکمیل میں غیرفطری رویہ اپناتے ہوئے اس قدر غلو اختیار کیا گیا (نظام رہبانیت کا ظہور) کہ جسم کے تقاضوں کی مکمل نفی کردی گئی۔ انسانی فطرت اور معاشرت اس بے اعتدالی کا تحمل نہیں کرسکتی تھی، لہٰذا ردعمل یقینی تھا۔ اس ردعمل نے مغربی فکر کو ایک دوسری انتہا پر لے جا کھڑا کیا اور روح کو بے معنی قرار دیتے ہوئے انسان کو محض ایک مادی وجود باور کیا گیا۔ عقل ونقل (روایت) کی کشمکش میں روایت کو بے معنی سمجھتے ہوئے عقل کی برتری کا نتیجہ اخذ کیا گیا۔ یہی صورتحال فرد اور معاشرے کے حقوق اور فرائض کے تعین میں پیش آئی۔ انفرادیت اور اجتماعیت یعنی فرد اور معاشرے کے درمیان مسلسل جاری رہنے والی کشمکش کا نتیجہ اس صورت میں نمودار ہوا کہ فرد کو انسانی حقوق

---

[23] Ibid

[24] رسل، برٹرینڈ، فلسفہ مغرب کی تاریخ، ترجمہ، پروفیسر بشیر احمد، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص۷۹۵

Dialogue Social Science Review (DSSR)
www.thedssr.com

ISSN Online: 3007-3154
ISSN Print: 3007-3146
Vol. 4 No. 6 (June) (2026)

کے نام پر ہواء نفس کی تسکین اور مادی و معاشی اعغراض ومنافع کا اسیر بنا دیا گیا۔ طاقت اور قوت مطلقہ کا مرکز ومنبع اور اجتماعی نظم کا کفیل "جدیدریاست" کی صورت میں ظاہر ہوا۔

آزادی کے نتیجے میں فقط اپنی ہی ذات میں منحصر ہوجانے اور انفرادیت پسندی کے باعث افراد کے باہمی تعلقات اور خاندانی نظام کی فطری ضرورت کا احساس آزادی کی خوگر جدید تہذیب اور انسان کے تصور سے بالاتر ہے۔ والدین اور اولاد کی باہمی محبت اور شفقت، ازدواجی وفاداری، عورتوں کی عزت مآبی ، چھوٹوں اور بڑوں کی باہمی تعظیم اور شفقت ، نوجوانوں کی اخلاقی استقامت، شرفاء کا معاملہ و سلوک ، باہمی تعلقات و ملاقات ، معاشرت میں وضعداری ، ہمایوں کے ساتھ حسن سلوک ، دوستوں کیلئے ایثار و قربانی اور عام انسانیت کیلئے جذبہ ہمدردی کے فقدان کی صورت میں جو خارہ آزادی اور انسانی حقوق کے نام پر جدید انسان کے حصے میں آیا ہے وہ محدود آزادی کی بہت بڑی قیمت ہے۔

خالق اور اس کے احکامات سے بے نیازی کے نتیجے میں شرف بندگی سے محرومی اور تمام انسانی علائق اور رحم کی رشتہ داریوں سے بے اعتنائی اور قطع رحمی کے باعث اپنی ذات اور انفرادیت کی تنہائیوں کا شکار ہوجانا اس آزادی کی اتنی بڑی سزا ہے جس کا تصور تک انسان نے نہیں کیا تھا۔ انسان کی روحانی اور سماجی تعلقات کی فطری ضرورتوں سے قطع تعلق یعنی "بُعد عن الخالق والخلق" دراصل بُعد عن الذات کی صورت میں ظاہر ہوا اور انسان اپنے آپ سے بھی اجنبی ہو گیا۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (الحشر، ۱۹)

(اور تم ان لوگوں کی مانند نہ ہوجانا، جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا، سو اللہ نے خود ان کی ذات کو ان سے بھلا دیا، یہی لوگ نافرمان ہیں)